قومی ذرائع ابلاغ پر ایک نظر

ڈاکٹر طاہر مسعود°

پاکستانی ذرائع ابلاغ چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے ارتقا پذیر ہو کر آج ایک منظم و منافع بخش صنعت کا روپ دھار چکے ہیں۔ ذرائع و وسائل میں اضافے، جدید ٹکنالوجی کے استعمال اور اپنے اثرات کی ہمہ گیری کے لحاظ سے قومی زندگی میں ان کا کردار جہاں قابل لحاظ اہمیت رکھتا ہے وہیں سنجیدہ غور و فکر کا طالب بھی ہے۔ یوں تو اطلاعاتی انقلاب (information explosion) اور عالم گیریت نے دنیا بھر میں ذرائع ابلاغ کے کردار و اثرات کو بحث و مباحثے کا موضوع بنا دیا ہے لیکن پاکستانی معاشرے میں جو اپنی راسخ العقیدگی اور مخصوص اقدار و روایات پر ایمان و ایقان کے سبب دیگر عام معاشروں سے منفرد واقع ہوا ہے، ذرائع ابلاغ کے اثرات نہایت سنجیدہ اور فکر انگیز سوالات کو جنم دیتے ہیں۔ ان سوالات کا تعلق ذرائع ابلاغ کی آزادی سے بھی ہے اور ان کے تاجرانہ انداز فکر سے بھی' ایک بے سمت قوم کو نشان منزل دکھانے سے بھی ہے اور قوم کے منزل پر پہنچ کر گم کردہ منزل ہو جانے سے بھی۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آج ہمارا معاشرہ انتشار و اضطراب کی لپیٹ میں ہے۔ اقدار کی شکست و ریخت، اخلاقی تباہ حالی' سیاسی افراتفری اور مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان نے ہمارے مستقبل کو ایک سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ ذرائع ابلاغ اس عمومی معاشرتی صورت حال کے عکاس بھی ہیں اور بڑی حد تک اس کے ذمہ دار بھی۔ معاشرے کی ابتری کی ذمہ داری ان پر عاید

° صدر شعبہ ابلاغ عامہ' جامعہ کراچی' کراچی

کرنے کے بارے میں یقیناً اختلاف رائے ہوسکتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملک کی ۵۹ سالہ زندگی میں کم وبیش تیس سال عملاً فوجی حکمرانی کے رہے ہیں جن میں ذرائع ابلاغ سے آزادانہ کردار ادا کرنے کی توقع عبث ہے۔ لیکن پھر یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا ہمارے ذرائع ابلاغ نے دیگر ملکوں کے ذرائع ابلاغ یا آزادی سے قبل کے عظیم صحافیوں کی طرح اپنی آزادی کے لیے کوئی جنگ بھی لڑی؟ کوئی قربانی بھی دی؟ یا جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ آج کے ذرائع ابلاغ کی آزادی بھی غیر جمہوری مزاج کے حامل ایک حکمراں کی کشادہ دلی کا مظہر ہے۔

آیئے! ماضی کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس ملک خداداد میں ریاست کے اس اہم ستون پر کیا گزری ہے، کیونکہ گذشتہ واقعات کا مطالعہ ہی حال کے نتائج کو قابل فہم بناتا ہے۔

آزادی کے بعد

پاکستان میں ذرائع ابلاغ کی تاریخ پابندیوں سے عبارت رہی ہے۔ مختلف ادوار میں خاکی اور غیر خاکی حکمرانوں نے ذرائع ابلاغ بالخصوص صحافت کو پابہ زنجیر کرنے کے لیے نہ صرف امتناعی قوانین نافذ کیے بلکہ پریس ایڈوائس اور سنسر شپ سے لے کر ترغیب وتحریص کے تمام ممکنہ حربے آزمائے ہیں تاکہ اظہار رائے کی آزادی اور حقائق کے انکشاف کے 'ضرر' سے محفوظ رہا جاسکے۔ یہ حقیقت افسوس ناک ہے کہ قائداعظمؒ کی زندگی ہی میں پریس ایڈوائس کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ پہلی پریس ایڈوائس قائداعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کے ایک حصے کے بارے میں جاری کی گئی کہ اسے شائع نہ کیا جائے۔ روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین نے اس حکم کو ماننے سے انکار کردیا، جس کی وجہ سے بیوروکریسی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ قائداعظمؒ جو صحافت کی آزادی پر پختہ یقین رکھتے تھے، ان کی وفات کے چند ہی روز بعد پبلک سیفٹی آرڈننس نافذ کردیا گیا حالانکہ بہ حیثیت گورنر جنرل اس آرڈننس پر انھوں نے دستخط کرنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ ان سیاہ قوانین کے خلاف تو میں ساری زندگی لڑتا رہا ہوں۔

۱۹۴۹ء میں سکیورٹی آف پاکستان ایکٹ دستور ساز اسمبلی سے منظور کرایا گیا، جو بعد کے دساتیر کا حصہ بنا اور جس کے تحت شہری آزادیوں بشمول آزادیِ تحریر وتقریر پر قدغن عاید کردی گئی۔

اس ایکٹ کے تحت اخبارات اور ان کے ایڈیٹروں کے خلاف کارروائی عمل میں آتی رہی مثلاً: ڈھاکہ کے انگریزی روزنامے پاکستان آبزرور کے ایڈیٹر عبدالسلام کو وزیراعظم خواجہ ناظم الدین پر تنقید کرنے کے الزام میں فروری ۱۹۵۲ء میں گرفتار کرلیا گیا۔ اس سے زیادہ دل خراش واقعہ ۷ مئی ۱۹۴۹ء کو پیش آیا تھا جب لاہور کے قدیم انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کی کشمیر کی بابت شائع کردہ ایک خبر پر ۱۶ ایڈیٹروں نے، جن میں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر فیض احمد فیض اور نوائے وقت کے ایڈیٹر حمید نظامی بھی شامل تھے، ایک مشترکہ اداریے کے ذریعے اس اخبار کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ خبر دہلی میں اخبار کے نامہ نگار اے این کمار نے ارسال کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ: ''جموں اور کشمیر کے تنازعے پر پاکستان اور بھارت میں مذاکرات جاری ہیں اور عنقریب دونوں ملکوں میں سمجھوتہ ہونے والا ہے جس کے مطابق جموں و کشمیر کو دونوں ملکوں میں تقسیم کردیا جائے گا''۔ اخبار نے اس من گھڑت خبر پہ معذرت کرلی تھی اور خبر بھیجنے والے اپنے نامہ نگار کو برطرف بھی کردیا تھا لیکن اخبار کا جرم معاف نہیں کیا گیا اور چھے ماہ کے لیے اس کی اشاعت روک دی گئی۔ نتیجے میں اس اخبار کو پھر سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کی تعدادِ اشاعت اور کاروبار دونوں تباہ ہوگئے۔ کیا اس کی ذمہ داری ان ۱۶ ایڈیٹروں پر عاید نہیں ہوتی جنھوں نے 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' کی اشاعت معطل کرنے پر حکومت کو اکسایا؟

۱۹۵۳ء میں پنجاب میں قادنیوں کے خلاف چلنے والی مہم کے دوران صحافت کو حکومت کی جانب سے ایک شرمناک طرزِعمل سے واسطہ پڑا۔ پنجاب کے پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نے متعدد اخبارات کو حکومت کا ہم نوا بنانے کے لیے تعلیم بالغان کے فنڈ میں سے رشوت دی۔ اخبارات کو کرپٹ کرنے کے لیے نقد رقم دینے کے علاوہ انھیں اشتہارات کی فراہمی اور روزانہ ایک خاص تعداد میں شمارے خریدنے کے وعدے بھی کیے گئے۔ اس اولین نام نہاد جمہوری دور میں سویرا، نقوش اور ادب لطیف جیسے معیاری ادبی رسائل، چٹان اور ایشیا جیسے جرأت مند ہفت روزہ رسائل اور نوائے وقت جیسے بے باک اخبار پر پابندیاں لگائی گئیں۔ غرض ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک صرف پنجاب میں ۳۱ اخبارات کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی۔

مارشل لا عہد

۱۹۵۸ء کا جنرل ایوب کا مارشل لا پاکستانی صحافت کے لیے تاریک ترین رات ثابت ہوا جس میں اخبارات ورسائل کو سیاہ قوانین کی بھاری بیڑیاں پہنا کران کی مکمل زباں بندی کردی گئی۔ ایوب حکومت کا پہلا قدم میاں افتخارالدین کے پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ پر غاصبانہ قبضہ تھا جس کے تحت پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز اور ہفت روزہ لیل ونہار چھپتے تھے۔ فکرونظر کے اختلاف کے باوجود یہ غیرمتنازعہ طور پر نہایت معیاری اخبارات تھے۔ پاکستان ٹائمز کا تو اجرا قائداعظم کی خواہش پر اوائل ۱۹۴۷ء میں ہوا تھا۔ پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ پر بیرون ملک (اشتراکی روس) سے امداد لینے کا الزام لگایا گیا' جسے کبھی کسی عدالت میں ثابت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ نیز میاں افتخارالدین کے اخبارات کی بابت یہ بھی کہا گیا کہ ''ان میں ایسا مواد شائع ہوتا ہے جو پاکستان کی سلامتی کے لیے خطرے کا موجب ہوسکتا ہے'' لیکن اس مواد کی نشان دہی کبھی نہیں کی گئی۔

اپریل ۱۹۶۴ء میں 'اخبارات کے معیار کو بلند کرنے کے لیے' فیلڈ مارشل ایوب خاں کی حکومت کے زیراہتمام نیشنل پریس ٹرسٹ (این پی ٹی) کا قیام عمل میں لایا گیا، جس میں پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ کے اخبارات کے علاوہ مارننگ نیوز، مشرق، دینک پاکستان (بنگالی)، اخبار خواتین' اسپورٹس ٹائمز اور روزنامہ انجام وغیرہ کے تمام ایڈیشنوں کو ضم کردیا گیا۔ ان انگریزی، اردو اور بنگالی اخبارات وجرائد کی تعداد ۱۲ تھی۔ نیشنل پریس ٹرسٹ نظری طور پر ایک آزاد ادارہ تھا لیکن عملاً یہ ایوب خان اور بعد کے ادوار میں بھی حکومت کا بھونپو بنا رہا۔ بقول ضمیر نیازی تین عشروں تک 'نیشنل پریس ٹرسٹ' کے اخبارات حکومت پر تنقید کرنے کا جرم کرنے والے افراد اور جماعتوں کی توہین' تذلیل اور کردارکشی کرتے رہے۔ این پی ٹی کی تشکیل کا اصل مقصد نجی ملکیت میں شائع ہونے والے اخبارات کی آزادی کو کچلنا اور ایک متوازی سرکاری پریس کا قیام عمل میں لانا تھا۔ اس سے تین سال قبل جون ۱۹۶۱ء میں حکومت 'عوام کے وسیع تر مفاد' میں آزاد خبررساں ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (اے پی پی) کو سرکاری تحویل میں لے چکی تھی جو آج تک سرکار ہی کی منکوحہ ہے اور جس سے آج بھی حزب اختلاف کی خبریں مشکل ہی سے جاری ہوتی ہیں۔

این پی ٹی کے قیام سے چار سال قبل ۲۶ اپریل ۱۹۶۰ء کو ایوب حکومت نے بدنام زمانہ پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کی ننگی تلوار صحافت کے سر پہ لٹکا دی۔ اس آرڈیننس کے تحت حکومت کو اخبارات یا کتابیں شائع کرنے والے چھاپہ خانے کے مالکان سے قابل اعتراض مواد شائع کرنے پر حکومت کو نئی ضمانت طلب کرنے کا اختیار مل گیا۔ قانون کے تحت اس میں ایسی تمام تحریریں شامل تھیں جنھیں ناشائستہ، فحش، گھٹیا، توہین آمیز یا بلیک میلنگ یا افواہیں پھیلانے یا عوام میں اضطراب، بے چینی یا مایوسی پھیلانے کے ارادے سے شائع کیا گیا ہو۔ اس قانون کے تحت کسی بھی بے ضرر خبر یا ادارتی نوٹ کے خلاف کارروائی ہوسکتی تھی۔ آرڈیننس کے نفاذ کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس کا مقصد ذمہ دارانہ اور صحت مند صحافت کی نشوونما ہے۔ ۱۹۶۳ء میں ترامیم کے ذریعے قانون کو مزید سخت بنا دیا گیا۔ برعظیم میں صحافت کی ۲۰۰ سالہ تاریخ میں اتنے سیاہ ترین قوانین نافذ نہیں ہوئے تھے جس کے نتیجے میں آزاد، جرأت مند اور اقداری صحافت کی توسیع و ترقی بری طرح متاثر ہوئی، بہت سے باضمیر صحافیوں نے بددل ہو کر اس پیشے ہی کو خیرباد کہہ دیا۔ یہ آرڈی ننس تین عشروں تک اخبارات کو دبانے، کچلنے اور نئے اخبارات و جرائد کے اجرا کا راستہ روکنے کے لیے مختلف حکومتوں کا آلۂ کار بنا رہا۔ اس کے تحت صحافیوں کو قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایک آزاد اور ذمہ دار صحافت پروان نہ چڑھ سکی۔ سیاسی خبروں پر پابندی کے باعث قارئین کی دل چسپی و رغبت کے لیے جنس و جرم اور سنسنی خیزیت اخبارات کا لازمہ بن گئے اور خوشامد پسند تجارتی اخبارات کو مستحکم ہونے کا موقع مل گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۸ء میں قائم مقام صدر غلام اسحٰق خان نے اس آرڈی ننس کو منسوخ کر دیا۔ ایوب دور میں محکمہ اطلاعات کے افسرانِ اطلاعات ہی عملاً اخبارات کے مدیر بن گئے تھے جنھیں کسی بھی خبر کو رکوانے یا چھپوانے کا اختیار حاصل ہوگیا تھا۔ حکومت سے علاحدگی کے بعد جنرل ایوب نے اعتراف کیا کہ پریس پر پابندی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

۱۹۶۴ء میں ایوب حکومت کا ایک اہم قدم ٹیلی وژن نشریات کا آغاز تھا۔ ٹیلی وژن کی پالیسی کے لیے پانچ نکاتی ضابطہ وضع کیا گیا جس کے مطابق اس کے مقاصد میں تعلیم کا فروغ، معلومات عامہ کی فراہمی، صحت مند تفریح، قومی سوچ اور باہمی اتحاد کا فروغ اور حقیقت پسندانہ،

منصفانہ اور آزاد خبروں کی پیش کش شامل تھی۔ لیکن اپنے قیام کے بعد سے یہ بالعموم تفریحی میڈیم بنا رہا۔ خبروں میں عملاً جو پالیسی وضع کی گئی، اس پر اس سے روشنی پڑتی ہے کہ لوگ آج بھی خبرنامہ کو 'صدرنامہ' کہتے ہیں۔

بھٹو دور حکومت

ذوالفقار علی بھٹو، جو ایوب حکومت کے آخری ایام میں پریس ٹرسٹ توڑنے اور پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس منسوخ کرنے کی نوید دیتے رہے تھے اور جنھوں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد سیاسی گھٹن کے خاتمے کے لیے آزاد صحافت کو فروغ دینے کا مژدہ سنایا تھا۔ ان کے مقتدر قلم سے جو اولین حکم نامہ جاری ہوا، وہ این پی ٹی کے اخبارات دی پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر زیڈ اے سلہری اور مارننگ نیوز کے ایڈیٹر ایس آر غوری کی فوری برطرفی تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے آزاد خبر رساں ایجنسی پی پی آئی کے سربراہ معظم علی کا بھی ناطقہ بند کر دیا۔ بھٹو ان بلند پایہ صحافیوں پر اس لیے غضب ناک تھے کہ انھوں نے ان کے انداز سیاست کو قلم کی نوک پر رکھا تھا۔ بھٹو دور اخبارات ورسائل کی بندش اور صحافیوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر اسیر زنداں کرنے سے عبارت ہے۔ پنجاب پنچ، زندگی، اُردو ڈائجسٹ، جسارت کے علاوہ بڑی تعداد میں روزنامے، ہفت روزے اور ماہنامے بند کیے گئے اور ان میں سے بہت سوں پر تو دوسرا کوئی اخبار یا جریدہ نکالنے پر بھی پابندی عاید کر دی گئی۔ صحافیوں کی ایک تعداد کو پس دیوار زنداں دھکیل دیا گیا۔ سرکاری اشتہارات اور نیوز پرنٹ کو بطور چارے کے بھی استعمال کیا گیا۔ ٹیلی وژن پر ایسے پروگرام شروع کیے گئے جن سے قائد عوام کو قائداعظم کا ہم پلّہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس دور حکومت کا اختصاص یہ بھی ہے کہ ذرائع ابلاغ کو قومی اخلاق تباہ کرنے کی کھلی چھوٹ دے دی گئی۔ ٹی وی، ریڈیو، فلم اور رسائل کو عریانی وفحاشی پھیلانے کے لیے استعمال کیا گیا تاکہ قوم کی توجہ سنجیدہ سیاسی مسائل سے ہٹائی جاسکے۔

جنرل ضیاء الحق کا عہد

جنرل ضیا نے اپنے اقتدار کے ابتدائی دنوں میں سہمی ہوئی زخم خوردہ صحافت کے ساتھ

مصلحتاً مشفقانہ برتاؤ رکھا اور جن اخبارات ورسائل کو بھٹو نے مصلوب کر دیا تھا، انھیں دوبارہ زندہ ہونے کا حق دیا گیا۔ سنسرشپ سے بھی اخبارات کو آزادی دی۔ لیکن اقتدار پہ گرفت مضبوط ہوتے ہی ان کی عطا کردہ آزادی صحافت کی اصلیت بے نقاب ہوگئی۔ اخبارات پر بدترین سنسرشپ، صحافیوں کی گرفتاریاں اور سزائیں اور ڈیکلریشن کی منسوخی کے علاوہ صحافت کی تاریخ کا جو سیاہ ترین واقعہ پیش آیا، وہ کھلے عام تین صحافیوں کو کوڑے مارنے کا فیصلہ تھا۔ اس دور میں اخبارات کی کاپیاں سنسر کے لیے محکمہ اطلاعات کے دفاتر لے جائی جاتی تھیں جہاں ہر سطر ہر لفظ سنسر ہوتا تھا۔ افسرانِ اطلاعات جس خبر، مضمون اور اداریے کو چاہتے بغیر کوئی وجہ بتائے کاپی سے نکال دیتے۔ بعض اخبارات خبرا کھڑنے کے بعد خالی جگہ پر قینچی کی تصویر بنا دیتے تھے۔ نئے حکم نامے میں صفحے پر خالی جگہ چھوڑنے پر بھی پابندی عاید کردی گئی۔ یہ صورت حال ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۹ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۸۲ء تک رہی۔

ضیا دور میں ہتک عزت کا ایک عجیب وغریب قانون یہ بھی نافذ ہوا کہ کوئی بھی توہین آمیز مواد خواہ وہ سچائی پر مبنی اور عوامی مفاد ہی میں کیوں نہ ہو، شائع نہیں ہوسکتا۔ یہ قانون جولائی ۱۹۸۶ء میں جونیجو حکومت نے واپس لیا۔ جنرل ضیا ملکی اور غیرملکی صحافیوں سے ذاتی دوستانہ مراسم استوار کرنے کے ماہر تھے۔ چنانچہ وہ دائیں بازو کے بااثر صحافیوں میں اپنے دوستوں کا وسیع حلقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان صحافیوں کو انھوں نے نوازنے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ۱۹۸۲ء میں سنسر اٹھانے کے بعد اخبارات کو تنقید واحتساب کی آزادی بڑی حد تک حاصل رہی۔ کوئی شبہہ نہیں کہ جنرل ضیا نے ذرائع ابلاغ کو جنس زدگی سے پاک کرنے اور انھیں مشرقی و اسلامی روایات سے ہم آہنگ کرنے کے اقدام بھی اٹھائے۔

صحافت کے خلاف تشدد کی نئی روایت

۱۹۸۰ء کے عشرے میں صحافت کے خلاف تشدد کے رجحان کا آغاز ہوا۔ یوں تو اخبارات کے خلاف دہشت گردی کا پہلا واقعہ ۲۴ جنوری ۱۹۶۹ء کو پیش آیا، جب ایوب حکومت سے اظہارِ نفرت کے لیے طالب علموں کے ایک مشتعل گروہ نے ڈھاکہ میں نیشنل پریس ٹرسٹ کے

دو اخبار مارننگ نیوز اور دینک پاکستان کے دفاتر کو نذر آتش کر دیا تھا۔ دوسرا واقعہ ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو رونما ہوا جب عوامی لیگ کے ترجمان اخبار دی پیپل ڈھاکہ کی عمارت کو ملٹری آپریشن کے دوران ڈھا دیا گیا۔ پھر بھٹو دور حکومت میں دی ٹائمز راولپنڈی اور جسارت کراچی کے دفاتر پر منظم منصوبہ بندی کے ساتھ حملے کرائے گئے۔

بعد کے عرصے میں بھی ملک کے مختلف حصوں میں اخبارات کے دفاتر پر حملے اور توڑ پھوڑ کے واقعات پیش آئے لیکن ۱۹۸۰ء کے عشرے میں صحافیوں کے خلاف بدترین دہشت گردی کا رجحان ابھر کر سامنے آیا جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جنوری ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۱ء تک اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتے ہوئے ۲۵ صحافی بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیے گئے' جب کہ ۲۰۰۵ء تک ہلاک ہونے والے صحافیوں کی تعداد دس ہے لیکن ان میں سے بیشتر صحافی افغانستان اور شمالی علاقہ جات میں مارے گئے۔ اخبارات کے دفاتر کو تباہ کرنا' پرنٹنگ پریس کو آگ لگا دینا' غنڈہ گردی کے ذریعے اخبارات کی ترسیل کو ناممکن بنا دینا تو اس عرصے میں ایک معمول بنا رہا۔ ان واقعات میں بیشتر لسانی اور بعض انتہا پسند مذہبی جماعتیں ملوث رہیں۔

نوائے وقت کراچی کے دفتر میں تو دو مرتبہ بم کے دھماکے کے واقعات بھی پیش آئے، جس کے بعد اس کا دفتر مزار قائد کے نزدیک سے ڈیفنس سوسائٹی کے نسبتاً محفوظ علاقے میں منتقل ہو گیا۔ روزنامہ جنگ کو ایک دن تقسیم نہیں ہونے دیا گیا۔ ہفت روزہ تکبیر کا دفتر نذر آتش کیا گیا۔ یہاں تک ہوا کہ جو لسانی تنظیم ان واقعات کی ذمہ دار تھی، اس سے مصالحت کے لیے کراچی کے اہم اخبارات کے مدیران اور مالکان جس میں روزنامہ جنگ کے میر خلیل الرحمٰن اور روزنامہ ڈان کے حمید ہارون شامل تھے' اس تنظیم کے قائد کے گھر پر دست بدستہ حاضر ہوئے اور ان کی ناراضی کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں 'جنگ' اخبار خصوصاً دباؤ کا شکار رہا جسے روزانہ یہ ہدایت ملتی تھی کہ مذکورہ لسانی تنظیم کی خبر کس صفحے پر اور کتنے کالم میں شائع ہوگی اور اخبار اس ہدایت کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ اخبارات اور صحافیوں کے خلاف دباؤ اور تشدد کے ان پے در پے واقعات میں ملوث کسی ایک ملزم کو بھی آج تک گرفتار کیا گیا اور نہ سزا دی گئی۔ اخبارات پر ناقابل برداشت دباؤ کے نتیجے میں خبروں میں آدھا سچ چھپنے لگا، انھیں توڑا مروڑا اور چھپایا جانے

لگا۔ یہاں تک ہوا کہ جس اخبار (روزنامہ ڈان) کے دفتر پر مشتعل کارکنوں کا جتھا چڑھ دوڑا، اُسے سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں، دفتر کو نقصان پہنچایا' اگلے دن متاثرہ اخبار اس واقعے کے بارے میں خاموش رہا۔ سب سے زیادہ دباؤ کا سامنا کراچی کے اخبارات کو کرنا پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ تشدد کی یہ روایت مستحکم نہ ہوسکی اور اخبارات اور صحافیوں کے خلاف لسانی، مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے اشتعال انگیز جذبات میں اب ٹھیراؤ آ گیا ہے لیکن برقیاتی ذرائع ابلاغ پر دباؤ اب بھی قائم ہے۔ پچھلے ہی دنوں جیو کے ایک پروگرام کے خلاف احتجاجا اس کا دفتر تباہ کیا جاچکا ہے۔ پروگرام کا موضوع جنسی مسائل تھا جن پر کھلی گفتگو اشتعال کا سبب بنی۔

ذرائع ابلاغ کا حالیہ منظرنامہ

جیسا کہ اس جائزے سے معلوم ہوا کہ ملک میں صحافت کا ارتقا خاکی اور غیر خاکی حکمرانوں کے ذاتی مفادات اور خواہشات کے زیراثر مرتبہ پالیسی کے ماتحت ہوا ہے۔ چنانچہ پابندی کے زمانے میں اِکا دُکا مستثنیات سے قطع نظر' ہمارے اخبارات کسی اچھے بچے کی طرح حکمرانوں کے سامنے موّدب رہے ہیں۔ (ایوب حکومت کے وفاقی سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر نے لکھا ہے کہ جنرل ایوب خان کے آمرانہ اقدامات کے خلاف بنگالی پریس نے اپنے جذبات کا اظہار مصلحت اندیش اور احتیاط سے کیا' جب کہ مغربی پاکستان میں پریس نے نہ تو آئین کی منسوخی پر صدائے احتجاج بلند کی' نہ اسمبلیوں کی تحلیل پر ہی کوئی ردعمل دکھایا۔ پریس نے تمام پابندیوں کو خاموشی سے قبول کرلیا حتیٰ کہ پریس سنسرشپ پر بھی اعتراض نہیں کیا۔) یہ الگ بات کہ جب پریس کو آزادی ملتی ہے تو وہ شتربے مہار ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جنرل یحییٰ خان کے زمانے (۱۹۷۱ء-۱۹۶۹ء) میں اخبارات صوبائی عصبیت، طبقاتی کش مکش اور فرقہ واریت کو ہوا دینے میں پیش پیش رہے۔

بعد کے ادوار میں بھی ملک کے اساسی اقدار و نظریات، قومی سالمیت اور اس کی بقا کے بارے میں ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے والا مواد اخباری صفحات کے ذریعے ہی عام ہوا۔ بعض اخبارات نے قومی اغراض و مقاصد کو تجارتی مفادات کے تابع رکھنے کی پالیسی اپنائی۔ چنانچہ سنسنی خیزیت، جنس زدگی اور قوم کے سستے جذبات کو انگیخت کر کے معمولی سرمایے سے اخبار کا اجرا

کرنے والے اصحاب آج اخباری گروپوں کے مالک بن چکے ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس مملکت خداداد میں صحافت کی کوئی سمت متعین نہیں ہو سکی۔

برقیاتی ذرائع ابلاغ تو مکمل طور پر سرکاری کنٹرول میں رہے اور آج بھی ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن کارپوریشن حکومت ہی کے کنٹرول میں ہیں۔ ان اداروں بالخصوص پی ٹی وی کو حکمرانوں نے اپنی ذات اور اپنی حکومت کے پروپیگنڈے اور تشہیر کے لیے جس بری طرح استعمال کیا ہے، اس کی چشم کشا تفصیل پی ٹی وی کے سابق ڈائریکٹر نیوز برہان الدین حسن نے اپنی تازہ کتاب پس پردہ میں بیان کی ہے۔ گویا برقیاتی ذرائع ابلاغ کا قبلہ تو حکومت ہی رہی لیکن نام نہاد آزاد صحافت بھی آج تک کسی ضابطہ اخلاق سے محروم ہے۔ اخبارات کی کارکردگی کی نگرانی کے لیے دوسرے ملکوں کی طرح پریس کونسل کا قیام ہنوز خواب ہے۔ آج بھی، جب کہ ذرائع ابلاغ بڑی حد تک آزاد ہیں، سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ذرائع ابلاغ کے حوالے سے ہمارے قومی اہداف و مقاصد غیر متعین ہیں۔ کسی حکمران نے غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد قومی امنگوں اور آرزوؤں کی روشنی میں ایک جامع میڈیا پالیسی مرتب کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ کبھی یہ سوال نہیں اٹھایا گیا کہ ایک مسلم ریاست میں ذرائع ابلاغ کا کردار کیا ہونا چاہیے اور اس کے خدوخال کیسے ہونے چاہییں۔ اس مسئلے پر سوچ بچار کی ضرورت سٹلائٹ نشریات اور کیبل ٹیلی وژن کی آمد کے بعد سے اور بڑھ گئی ہے۔

کیبل ٹی وی کے اثرات

۱۹۹۰ء میں حکومت نے پرائیویٹ سیکٹر کو اجازت دی کہ وہ اپنے ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن قائم کریں۔ جس کے نتیجے میں ایف ایم ریڈیو اور کیبل ٹی وی چینلوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ (اب تک ۱۴۲ ایف ایم ریڈیو اور ۱۶ کیبل ٹی وی چینلوں کو لائسنس جاری کیے جا چکے ہیں، جب کہ متعدد چینلوں کی نشریات بیرون ملک سے جاری ہیں۔) ان کی نگرانی اور قانون سازی کے لیے ۲۰۰۲ء میں پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پمرا) کا ادارہ قائم کیا گیا۔ اس ادارے نے لائسنس کے اجرا کی شرائط و ضوابط میں ایک شرط یہ رکھی ہے کہ نشریات یا کیبل ٹیلی وژن چلانے

والے شخص کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ''بے راہ روی پر اکسانے والے اور شرافت کے مسلّمہ اصولوں کے منافی مواد نشر کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا''۔ اسی طرح اس کے ضابطہ اخلاق میں غیرملکی نشریات کے حوالے سے درج ہے کہ ''پمرا کسی بھی غیرملکی نشریات کا متن ناقابل قبول ہونے پر اسے نشر کرنے پر پابندی کا حکم جاری کرے گی''۔ متن کی نوعیت کی وضاحت میں ذوق سلیم، شرافت اور اخلاق کے منافی نشریات شامل ہیں۔

ان قواعد کی خلاف ورزی پر پمرا کو جواب دہی کی ضروری کارروائی کے بعد لائسنس کی منسوخی کا اختیار حاصل ہے۔ لیکن کیا پمرا ان ضوابط وشرائط کی پابندی کیبل ٹیلی وژن چلانے والوں سے کرا رہی ہے؟ کیا ''بے راہ روی پر اکسانے والے اور شرافت کے مسلّمہ اصولوں کے منافی مواد'' کی پیش کش مختلف ملکی اور غیرملکی چینلوں سے جاری نہیں ہیں؟ جنسی اختلاط کے مناظر، بوس وکنار، بچوں اور نوجوانوں میں غیراخلاقی اور غیرصحت مند تفریح کے رجحان کو پروان چڑھانے والے پروگرام مسلسل ٹیلی وژن اسکرین پر روشن نہیں ہیں؟ آخر پمرا نے ان قواعد وضوابط کی خلاف ورزی پر آج تک کتنے لائسنس منسوخ کیے ہیں؟ اور غیراخلاقی مواد کی بنیاد پر کتنی غیرملکی نشریات پر پابندی لگائی ہے؟ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ ادارہ تاحال بہت موثر ثابت نہیں ہوسکا ہے۔ مغربی اور بھارتی چینلوں کے ذریعے ہمارے معاشرے کو ثقافتی یلغار کا سامنا ہے۔ ہماری زبان، ہمارا مذہب، ہماری تہذیبی وثقافتی روایات سب خطرے سے دوچار ہیں۔ کیبل آپریٹر رات گئے عریاں اور فحش فلمیں چلا دیتے ہیں۔ کئی چینلوں پر ایسے پروگرام دکھائے جارہے ہیں جو نئی نسل کے کردار و ذہن میں اخلاق باختگی کا بیج بو رہے ہیں۔ (مثلاً ایک چینل پر پروگرام 'مستی مستی' اس کی مثال ہے)۔ پمرا ان کیبل آپریٹروں اور چینلوں کو کنٹرول کرنے سے عاجز ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان چینلوں پہ حالات حاضرہ کے معیاری اور معلومات افزا تجزیاتی پروگرام بھی پیش کیے جارہے ہیں جن میں اظہار خیال کی بہت آزادی نظر آتی ہے۔ لیکن ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ اطلاعات اور اطلاعات کے تجزیوں کی بھرمار سے عام آدمی کا ذہن ماؤف ہورہا ہے۔ اس کے لیے یہ فیصلہ دشوار ہے کہ کس تجزیے کو صحیح سمجھے اور کسے غلط۔ اطلاعات اور اس کے پس منظری وپیش منظری مواد کی کثرت میں عام آدمی کی قوت تمیز اور قوت فیصلہ کا متاثر ہونا قابل فہم

ہے۔ چنانچہ ذرائع ابلاغ کی آزادی نے خود اس آزادی کی اہمیت و معنویت کے بارے میں بڑے سنگین اور توجہ طلب سوالات پیدا کر دیے ہیں، مثلاً: پہلا سوال تو یہی ہے کہ ذرائع ابلاغ کی آزادی معاشرے میں کون سے مثبت نتائج پیدا کر رہی ہے۔ کیا یہ آزادی کسی تبدیلی کو جنم دینے کا سبب بن رہی ہے، یا اس سے محض جذبات کا کتھارسس ہو رہا ہے۔

یہ مسئلہ اس تناظر میں اور اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے جب یہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ حکومت اور اس کے ادارے ذرائع ابلاغ کی خبروں، تبصروں، تجزیوں اور تنقیدوں کو سنجیدہ توجہ کے لائق ہی نہیں سمجھتے۔ انھوں نے ذرائع ابلاغ کی طرف سے بے گانگی اور بے حسی کا رویہ اپنا لیا ہے۔ ''آزادیِ رائے کو بھونکنے دو اور اپنی پالیسی جاری رکھو'' یہ ہے وہ اسٹرے ٹیجی جسے حکومت نے اختیار کر رکھا ہے۔ گذشتہ پانچ ساڑھے پانچ برسوں میں ذرائع ابلاغ نے حکومت کی داخلی اور خارجی پالیسیوں پر کھل کر تنقید کی، لیکن حکومت نے ان کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ نائن الیون کے بعد اختیار کی جانے والی خارجہ پالیسی اس کی زندہ مثال ہے جسے حکومت نے ذرائع ابلاغ کی بے محابہ گرفت و احتساب کے باوجود آج تک جاری رکھا ہوا ہے۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ سرکاری معلومات تک رسائی کے قانون کی منظوری کے باوجود سرکاری اعداد و شمار، حقائق اور دستاویزات صحافیوں کی دست رس سے آج بھی دور ہیں۔ ایک امریکی، برطانوی یا گوری نسل کے صحافی کو سرکاری مخمّل مارے احساس کمتری کے جو حقائق فراہم کر دیتے ہیں، ان ہی معلومات کی فائلوں پر مقامی صحافیوں کے لیے 'سرکاری راز' کی چٹ لگا دی جاتی ہے۔ اس صورت حال میں خبروں اور بالخصوص تفتیشی خبروں کا معیار بلند اور اعتبار بحال کیسے ہو سکتا ہے۔

ہمارے ذرائع ابلاغ کو آج گوناگوں مسائل کا سامنا ہے۔ آبادی کے تناسب سے اخبارات کی اشاعت تشویش ناک حد تک کم ہے۔ تقریباً ۱۴ کروڑ آبادی کے ملک میں صرف ۲۵ لاکھ اخبارات چھپتے ہیں۔ گویا ایک اخبار ۵۷ افراد کے لیے، جب کہ جاپان میں صرف ایک اخبار یورمی اوری شمبون کی اشاعت ایک کروڑ دو لاکھ ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ برقیاتی ذرائع ابلاغ کی بے پناہ مقبولیت نے مطبوعہ صحافت کی اشاعت کو متاثر کیا ہے۔ یہ عالمی رجحان ہے۔ امریکا میں ۱۹۹۰ء میں جن روزناموں کی اشاعت ۶ کروڑ ۳۰ لاکھ تھی، وہ اب گھٹ کر ۵ کروڑ ۵۲ لاکھ

رہ گئی ہے۔ برقیاتی ذرائع ابلاغ کی infotainment (انفارمیشن + انٹرٹینمنٹ) پالیسی مطبوعہ ذرائع ابلاغ پر قارئین کے انحصار، اعتبار اور دل چسپی کو نقصان پہنچانے کی باعث ہے۔ یوں بھی ہمارے ہاں اخبارات ناروا حد تک مہنگے ہیں، شرح خواندگی شرمناک حد تک کم ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ بھی سیاسی اور سماجی مسائل سے لاتعلق رہتا ہے۔ کاغذ مہنگا ہونے کی وجہ سے بڑے اخبارات اشاعت بڑھانے میں دل چسپی نہیں رکھتے۔ اخبارات بالخصوص اردو اخبارات کا معیار محل نظر ہے۔ وہ انگریزی اخبارات کے مقابلے میں دانش وری، حقائق و واقعات کے گہرے تجزیے، عالمی واقعات کی بابت تفصیلی معلومات کی فراہمی، پس منظری مواد اور حوالہ جات سے تقریباً محروم ہوتے ہیں۔ خبریں واقعات سے زیادہ بیانات کا احاطہ کرتی ہیں، اور یہ خبریں بھی صفحہ اوّل پر نہایت تشنہ طریقے سے شائع کی جاتی ہیں۔ یہ خبروں سے زیادہ خبروں کا اشاریہ (index) نظر آتی ہیں۔ چنانچہ قارئین میں سرخیاں پڑھ کر اسی پر اکتفا کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔

اخبارات کے صفحہ اول پر اکثر اوقات بڑے بڑے اشتہاروں نے خبروں کی جگہ گھیر رکھی ہوتی ہے۔ تجارتی منافعے کی ہوس میں قاری کی توقعات کا خون کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ اخبارات تفتیشی خبریں غالباً اس لیے شائع نہیں کرتے کہ یہ ذرا مہنگا سودا ہے۔ اخراجات بڑھنے کے علاوہ بدعنوانیوں کے انکشاف میں خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ بعض اخبارات میں ایک نیا رجحان مسخ شدہ، کٹی پھٹی اور سر بریدہ لاشوں کی رنگین تصاویر کی اشاعت کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ مہذب ملکوں میں اخبارات ایسی تصویریں شائع نہیں کرتے۔ صحافیوں کے کردار اور ان کی ساکھ بھی ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ صحافتی اثر و رسوخ کا ناجائز استعمال، لفافہ جرنلزم اور پلاٹ پرمٹ کی صحافت کا غیر اخلاقی رویہ بتدریج فروغ پذیر ہے۔

انگریزی اخبارات جو بین الاقوامی امور، تعلیم، صحت، ماحولیات اور ادب و فنون لطیفہ کے بارے میں معلومات افزا مواد پیش کرتے ہیں، مزاجاً لبرل اور سیکولر پالیسی رکھتے ہیں۔ نفاذ شریعت کی مخالفت، 'ملاؤں' کا استہزا اور قرارداد مقاصد کی علانیہ خلاف ورزی غالباً وہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ملک کے طبقہ اشرافیہ کے ترجمان ہیں جو مذہب بیزار ہے۔

بیسویں صدی کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ دنیا بھر میں محکوم ملکوں نے حصول آزادی کے بعد،

قومی ذرائع ابلاغ کے اداروں کو اپنے اجتماعی مقاصد ومفادات کی تشہیر و پاسبانی کے لیے پروان چڑھایا اور انھیں آزادی کے ساتھ ساتھ مناسب سہولتیں بھی بہم پہنچائیں' وہاں پاکستان کی تمام حکومتوں کی یہ شناخت قابل افسوس رہی ہے کہ انھوں نے اپنے محدود مفادات اور دل چسپی کی حد تک صحافت کو مختلف پابندیوں میں جکڑے رکھا۔ پھر اہل صحافت کو چھوٹی موٹی آزادی کے احساس کے طور پر قومی اخلاقیات سے کُھل کھیلنے کی اجازت دے دی جس کے نتائج پرانی نسل کی بے حسی اور بے عملی اور نئی نسل کی بے راہ روی اور اخلاق بیزاری کی صورت میں ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔

تجاویز

ذرائع ابلاغ کے مسائل حل کرنے' نیز ان کا قبلہ درست رکھنے کے لیے درج ذیل اقدامات اٹھانے کی سخت ضرورت ہے:

۱- حکومت مختلف اداروں کی سطح پہ بحث ومباحثے کے بعد ایک قومی میڈیا پالیسی مرتب کرے' تاکہ ذرائع ابلاغ کی ایک سمت اور جہت متعین ہوسکے۔ نیز ان کی ترجیحات سامنے آسکیں۔

۲- ذرائع ابلاغ کے لیے جس ضابطۂ اخلاق کا ڈول ڈالا گیا تھا اور جو باہمی اختلاف ونزاع کا شکار ہوکر سرد خانے کی نذر ہوگیا، اس پہ دوبارہ بات چیت شروع کی جائے اور اسے حتمی شکل دے کر نافذ کیا جائے۔

۳- اخبارات کے مواد ومعاملات کی نگرانی کے لیے پریس کونسل تشکیل دی جائے۔ پڑوسی ملک بھارت میں پریس کونسل کے قیام کا تجربہ کامیاب ہوسکتا ہے تو یہاں کیوں نہیں ہوسکتا۔

۴- مغربی اور بھارتی چینلوں کے ایسے پروگراموں پر پابندی عاید کی جائے جو مذہبی' ثقافتی اور قومی اعتبار سے ضرر رساں ہوں۔ بالخصوص غیر اخلاقی اور ہیجان انگیز مناظر کو قطعی طور پر سنسر کیا جائے۔

۵- ڈاکٹروں کی طرح صحافیوں سے بھی پیشۂ صحافت میں داخلے سے پہلے دیانت، امانت اور قومی اقدار وروایات اور دوقومی نظریے کی پاس داری کا حلف لیا جائے۔ یہ حلف ملکی

جامعات کے شعبہ ہاے ابلاغ عامہ کی تعلیمی زندگی کے اختتام پر مستقبل کے صحافیوں سے لیا جاسکتا ہے۔

۶- اخبارات کو پابند کیا جائے کہ وہ اشتہارات کو صحافتی مواد پر ترجیح دے کر قارئین کے حق کو غصب کرنے سے باز رہیں۔

۷- اخبارات میں ایک آدھ استثنا سے قطع نظر مالکان نے انتظامی کے ساتھ ساتھ ادارتی امور پر بھی تصرف حاصل کرلیا ہے، جس کی وجہ سے ایڈیٹر کا ادارہ عملاً ختم ہوتا جارہا ہے۔ اس سے صحافت میں پیشہ ورانہ انداز کار اور رویوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ لہٰذا اخبارات کے مالکان ایڈیٹر کو اس کے اختیارات تفویض کریں۔

۸- سرکاری معلومات تک رسائی کے قانون کو موثر بنانے کے لیے اخبارات کو اس قانون کے تحت حاصل سہولتوں کی فراہمی کا اہتمام کیا جائے۔

۹- امریکا کے وفاقی تجارتی کمیشن (FTC) کے طرز پہ کمیشن یا محکمہ قائم کیا جائے جو مخربِ اخلاق اور مضرصحت اشیا کے اشتہارات پر کڑی نگرانی رکھے اور ایسے مشتہرین پر جرمانہ عاید کرے اور ان اشتہارات پر پابندی عاید کرے جو قومی اور اخلاقی زندگی کے لیے مضر ہوں۔

کتابیات

۱- ضمیر نیازی پری - ۱۹۴۷ء مسلم اینڈ پاکستان: آل ازناٹ لاسٹ، مشمولہ دی ساؤتھ ایشین سنچری ۱۹۹۹ء-۱۹۰۰ء آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس کراچی (۲۰۰۱ء)

۲- ضمیر نیازی صحافت پابند سلاسل، پاکستان اسٹڈی سنٹر، یونی ورسٹی آف کراچی (۲۰۰۵ء)

۳- پاکستان میں الیکٹرانک میڈیا کی ترقی اور فروغ، پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (۲۰۰۳ء)

۴- طاہر مسعود (مرتب) صحافت اور تشدد، کراچی یونی ورسٹی جرنلزم المنائی ایسوسی ایشن (۱۹۹۰ء)

۵- برہان الدین حسن پس پردہ جنگ پبلشرز، لاہور (۲۰۰۵ء)

۶- کیبل ٹیلی وژن، مستقبل کا منظرنامہ، پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (۲۰۰۳ء)

۷- ذرائع ابلاغ عامہ' ایک جائزہ (مرتبہ: عصمت آرا) شعبہ ابلاغ عامہ، جناح یونی ورسٹی برائے خواتین' کراچی (۲۰۰۴ء)